ڈاکٹر صابر آفاقی

ایران اور کشمیر کے تعلقات

اگرچہ ہمارے قدیم مؤرخین اور شعرا خطۂ کشمیر سے وادیٔ کشمیر مراد لیتے رہے ہیں لیکن اس ریاست میں جموں اور ایک حد تک گلگت کا علاقہ بھی شامل رہا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی جغرافیائی سرحدیں پاکستان، تبت، چین اور بھارت سے ملتی ہیں۔ قدیم ترین ادوار سے ہی یہ خطۂ گل و لالہ پڑوس کے ممالک سے مذہبی، فکری اور سیاسی طور پر متاثر ہوتا رہا ہے۔

قدیم ایام سے لے کر ۷۲۵ء تک کشمیر پر ہندومت اور بدھ مت کے پیرو راجاؤں کی حکومت رہی ہے، مگر ان زمانوں میں بھی ترکستان اور افغانستان کے راستے ایران کے تمدن اور وہاں کی ثقافت کے اثرات کشمیر تک پہنچتے رہے۔

مؤرخین کی رائے ہے کہ جب آریائی قبائل اپنے اصلی وطن کو خیرباد کہہ کر سفر پر نکل کھڑے ہوئے تو وہ سغد کی طرف بڑھے۔ ان قبائل کا ایک گروہ کشمیر چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔

کوروش اعظم (۵۶۹ ق م) کے عہد میں ایران کی حکومت کی وسعت ماوراء النہر تک تھی اور قیاس کیا جاتا ہے کہ سندھ اور پنجاب کے علاقے بھی اس سلطنت میں شامل تھے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ہخامنشیوں کے دورِ حکومت میں کشمیر کے تعلقات ایران قدیم کے ساتھ بہت گہرے تھے اور کشمیر میں ایرانی تمدن جڑیں پکڑ رہا تھا۔ البتہ یہ تمدن یہاں بخارا، سمرقند اور مرو کے راستے پہنچا تھا۔ کیوں کہ پرانے زمانے میں کشمیر کی تجارت ترکستان سے ہوتی تھی اور دھاتیں اور ابریشم خاص طور سے اہلِ کشمیر ایرانِ قدیم کے علاقوں سے درآمد کرتے تھے۔ اس طرح سامانِ تجارت کے ساتھ ایرانی تمدن بھی پہنچا تھا۔

کتاب "مجمل التواریخ" میں مذکور ہے کہ اسفندیار کیانی کے بیٹے بہمن بادشاہ نے کشمیر کے راجہ سور کی دختر کسیالون سے شادی کی تھی۔ یہ واقعہ اگر درست ہے تو اس سے ایران و کشمیر کے

مستحکم اور نزدیکی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح ایران کے بادشاہ شاہ پور اول (۲۴۱-۲۷۲ء) کے عہد میں وہاں کا ایک مفکر و مصلح مانی جب جلاوطن کیا گیا تو اسے بھی اسی سرزمین کشمیر نے پناہ دی اور وہ کئی سال تک آرام سے یہاں مقیم رہا۔ پھر مانی تبت اور چین کے علاقوں میں پہنچا اور بے شمار اہل تبت و ترکستان کو اس نے اپنا ہم عقیدہ بنالیا۔ یہ غالباً پہلی فکری تحریک تھی جو مانی کے ذریعے ایران سے کشمیر پہنچی۔

ساسانیوں کے دور میں ایرانی تمدن و تہذیب کو کشمیر میں اور بھی فروغ ہوا۔ کتاب "رہنمائے آثار باستانی کشمیر" (انگریزی) کے مؤلف کی رائے میں ہارون سرینگر میں بدھ معبد کی طرز تعمیر اور بدھ کے مجسموں سے صاف نظر آتا ہے کہ ساسانی دور کا طرز تعمیر کشمیر میں مقبول تھا۔

بعض مؤرخین و علما کا خیال یہ ہے کہ کتاب کلیلہ و دمنہ کشمیر ہی میں مرتب ہوئی تھی۔ جسے ساسانی بادشاہ انوشیروان کے حکم سے حکیم برزویہ یہاں سے نقل کر کے ایران لے گیا تھا۔ اس خیال کی تائید ایران کے محقق مرحوم سعید نفیسی نے بھی کی ہے۔

کشمیر پر ایرانی تمدن، مذہب، ثقافت اور ادب کے اثر کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پنڈت کلہن کی تحقیق کے مطابق کشمیر کے راجہ للتادت (۶۱۵ - ۶۵۲ء) نے ایالات خراسان پر حملہ کر کے کابل، قندہار، یہاں تک کہ بخارا کو بھی فتح کیا اور ان علاقوں کو سلطنت کشمیر میں شامل کر لیا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد سامانیوں کے عہد میں بھی کشمیر سے ایران کے تعلقات نہ صرف یہ کہ برقرار رہے بلکہ اور بھی گہرے ہوئے۔ چونکہ سامانیوں کا عہد الحکومت بخارا تھا اور چین و بخارا کے ساتھ کشمیر کے تعلقات پہلے سے ہی استوار تھے لہٰذا بدیہی امر ہے کہ ان کے عہد حکومت میں ایران قدیم اور کشمیر باستان ایک دوسرے کے اور نزدیک آ گئے تھے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سامانی عہد کے فارسی شعرا کے کلام میں کشمیر اور کشمیر ایران کا ذکر ایک ساتھ ہوتا رہا ہے اور انھوں نے سرو کشمیر و نگار کشمیر کو بطور ضرب المثل استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر بہرامی کرخی (۵۰۰ھ) کہتا ہے:

نہ دیدی، نہ بینی چو روی تو مدش
نگاری بکشمیر و سروی بکشمر!

اسی طرح امیر معزی (۵۴۲ھ) کہتا ہے:

بلند قامتِ ایشان چو سرو در کشمیر
بدیع صورت ایشان چو نقش در کشمیر

یہی نہیں کہ ایران و کشمیر کی آب و ہوا ایک جیسی ہے اور دونوں ملکوں کا تمدن ایک سا ہے بلکہ مشابہت کا عالم یہ ہے کہ مشہد مقدس کے نزدیک کشمیر اور وادیٔ کشمیر کا زعفران بھی دنیا میں مشہور ہے۔ اسی سامانی دور میں عمارہ مروزی، فرخی سیستانی، عنصری، قطران تبریزی، عمعق بخارائی، منوچہری اور انوری جیسے باکمال ایرانی شاعروں نے کشمیر کے قصیدے لکھے اور اس جنتِ ارضی کے حسن و جمال کے گیت گائے۔ دونوں ممالک کے تعلقات اس قدر استوار ہوتے چلے گئے کہ آخر کار کشمیر کو بھی ایرانِ صغیر کہا جانے لگا۔

کشمیر کو جن مشابہتوں کی بنا پر ایرانِ صغیر کہا گیا ان کے بارے میں کشمیر میں "فارسی ادب کی تاریخ" کے مؤلف نے یہ رائے پیش کی ہے کہ:

"فارسی کا کشمیر سے خاص ربط رہا ہے اور یہاں کی علمی اور ادبی زندگی پر فارسی کا بہت اثر پڑا ہے۔ گزشتہ چھ ساڑھے چھ سو برسوں سے اس سرزمین سے فارسی کے ایسے عالم اور ادیب اُٹھے جن کا مقام فارسی ادب کی تاریخ میں گھٹایا نہیں جا سکتا۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ آب و ہوا اور جغرافیائی خصوصیات کی یکسانیت کے سبب سے اہلِ ایران، کشمیر کو ایرانِ صغیر کے نام سے موسوم کرنے لگے تھے۔" بہرصورت وجوہات کچھ بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ کشمیر ہمیشہ ثقافتی، لسانی اور روحانی اعتبار سے ایران سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ لوگ آپس میں بات چیت بھی فارسی میں کرتے رہے ہیں۔ فارسی زبان ۱۹۲۴ تک یہاں کی سرکاری زبان رہی ہے۔ لباس وہی ایرانی رہا ہے۔ شاعری کے علاوہ اہلِ کشمیر کی موسیقی بھی ایرانی رہی ہے۔ رباب، طنبور، سنتور، یہاں ایران سے آئے اور خطاطی و مصوری بھی ایران سے آئی۔ حد یہ ہے کہ پودے کو پیوند لگانے کا طریقہ بھی اہلِ کشمیر نے ایرانیوں سے سیکھا۔

ایران و کشمیر کے تعلقات کی کڑیاں ملانے کے لیے ہمیں پیچھے پلٹنا پڑے گا تاکہ ہم تاریخ کے نقوش پا کو تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھ سکیں۔ تو آیئے اس تلاش و جستجو کا سفر اس مقام سے

شروع کریں جب عرب کے جیالے سپوت محمد بن قاسمؒ نے سندھ پر حملہ کیا۔ وہ صوبۂ فارس سے گزر کر یہاں پہنچا تھا اور اس کے لشکر میں فارس کے دلیر بھی تھے۔ چونکہ ریاستِ کشمیر جنوب کی طرف سے سندھ کی ہمسایہ تھی، اس لیے بعید از قیاس نہیں اگر کچھ ایرانی اور عرب سپاہی کشمیر میں بھی آ گئے ہوں

قرنِ پنجم ہجری کے آغاز میں محمود غزنویؒ (م ۴۲۱ھ) نے نگرکوٹ اور پونچھ کی طرف سے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ اسے سیاسی کامیابی تو نہیں ہوئی مگر متعدد مورخین نے لکھا ہے کہ کچھ فوجی کشمیر کی وادی میں داخل ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس طرح محمود غزنوی نے ایک بار پھر کشمیر کو خراسانی تمدن سے آشنا کر دیا تھا۔ چنانچہ ایران کے لسانی نفوذ کی چند مثالیں ہمیں کلہن کی راج ترنگنی میں ملتی ہیں۔ یہ تاریخ ۱۱۴۹ء کی تالیف ہے اور اس میں دبیر اور گنجور کے فارسی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اگرچہ آٹھویں صدی ہجری کے شروع تک کشمیر پر ایرانی اثرات زیادہ واضح اور مستقل نہ تھے لیکن ۷۲۵ھ کے بعد ایرانی تمدن و تہذیب براہِ راست کشمیر پہنچے اور یہ علاقہ فارسی زبان اور فارسی معاشرت کے زیرِ اثر آ گیا۔ سال مذکور میں ایک صوفی مبلغ سید شرف الدین عبدالرحمٰن بلبل شاہ ترکستانی، جو شاہ نعمت اللہ ولی کے مرید تھے، چند مریدوں کے ہمراہ کشمیر پہنچے۔ ان کی تبلیغ سے کشمیر کا بدھ راجہ جس کا نام رینچن تھا حلقہ بگوشِ اسلام ہوا اور صدر الدین کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ حضرت بلبل شاہ کو کشمیر میں اسلام کا اوّلین مبلغ سمجھا جاتا ہے بلبل شاہ نے فارسی کو ذریعۂ تبلیغ بنایا تھا اور اس طرح وادی میں انھوں نے اسی زبانِ شیریں کو رواج دے کر ایران و کشمیر کے تعلقات کو اور مضبوط و مستحکم کر دیا۔

حضرت بلبل شاہؒ کے بعد ایرانی مبلغینِ اسلام کا دوسرا کاروان سید علی ہمدانیؒ کے ہمراہ کشمیر پہنچا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ سید علی ہمدانی ۷۷۴ھ میں ختلان میں تھے، جب ان کا کسی بات پر امیر تیمور (۷۷۱ - ۸۰۶ھ) کے ساتھ اختلاف ہو گیا۔ ویسے بھی تیمور کی سادات دشمنی تو مشہور ہے۔ سید علی ہمدانی تیمور کے مظالم سے بچنے کی فکر میں تھے۔ برِ کبیر پاک و ہند میں ان کو محفوظ اور پُر امن خطہ کشمیر نظر آیا اور ۷۷۴ھ میں سات سو ایرانی علما و صوفیا کے ایک قافلہ

کے ساتھ کشمیر پہنچے۔ اس قافلہ میں ہمدان، بیہق، سبزوار اور سمنان کے سادات تھے۔ آپ کے حکم کے مطابق یہ حضرات وادی کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اسلام کی تبلیغ اور فارسی زبان کی ترویج کرنے لگے۔ ان کا پیشہ زراعت اور صنعت و حرفت تھا۔ یہ دینی تحریک اس قدر ہمہ گیر تھی کہ جلد ہی وادی میں تقریباً سینتیس ہزار لوگ مسلمان ہو گئے اور ان کی زندگی میں ایک عظیم اور دُور رس نتائج کا حامل عملی و فکری انقلاب آگیا۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں حضرت سید علی ہمدانی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے:

سید السادات سالارِ عجم — دستِ او معمارِ تقدیرِ امم
خطہ را آن شاہِ دریا آستین — داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مردِ ایرانِ صغیر — با ہنرہائے غریب و دل پذیر
مرشدِ معنی نگاہان بودہ است — محرمِ اسرارِ شاہان بودہ است

سید علی ہمدانی ایک عالم، صوفی، سیاح، مبلغ، شاعر اور مؤلف تھے۔ ان کو علوم و فنون میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ عربی و فارسی کے زبردست مؤلف تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض خان کی تحقیق کے مطابق آپ کی عربی و فارسی تالیفات و رسائل کی تعداد سو تک پہنچتی ہے۔ سید علی ہمدانی نے وادی میں ایرانی صنائع کو ترویج دینے کے علاوہ جو بڑا کارنامہ انجام دیا وہ سرینگر میں مدرسہ اور خانقاہ کا قیام تھا۔ آپ نے اس شہر میں ایک عظیم الشان کتاب خانہ کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے ترکستان سے اپنے عربی و فارسی کتاب خانہ کو بھی یہیں منتقل کر دیا تھا۔

ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے کہ تبت کا علاقہ بھی قدیم زمانے میں کشمیر کے ماتحت تھا۔ لداخ کو تبتِ کلاں اور بلتستان کو تبتِ خورد کہا جاتا تھا۔ اہلِ بلتستان کی تواریخ و روایات کے مطابق اس علاقہ میں بھی اسلام سید علی ہمدانی کی کوششوں سے پھیلا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ آپ نے سکردو پہنچ کر اسلام کی تبلیغ کی اور یہاں کے بدھ عوام نے مسلمان ہونا شروع کیا۔ آپ نے کھری ڈونگ کے قریب ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ اس کے بعد گمبہ سکردو میں دوسری مسجد بھی آپ ہی نے تعمیر کروائی۔ سکردو میں اسلام کی تبلیغ اور اصلاحِ نفوس کے کام سے

فارغ ہو کر آپ شگر تشریف لے گئے اور بقول مولوی حشمت اللہ خان آپ نے کوتھنک سے لے کر نالہ برالدو کے آخیر تک ایک طرف اور نیلی سے لے کر باشہ تک دوسری طرف آوازۂ اسلام بلند کیا[1] بعد ازاں آپ نے امبورک میں مسجد تعمیر کروائی - پھر مسجد چھبرو نجی تعمیر ہوئی۔

سید علی ہمدانی کے ورودِ بلتستان کے بارے میں راقم نے ایک نامکمل فارسی مخطوطہ "ریاض الجنان" میں پڑھا ہے، جو وہاں کے ایک دانش مند پروفیسر مہر داد نے سکردو میں دکھایا تھا۔

سید علی ہمدانی کی وفات کے بعد بھی ایران و کشمیر کے روحانی و لسانی رشتے برقرار رہے آپ کے لائق فرزند میر محمد ہمدانی (م: ۸۵۴ھ) ۷۹۸ھ میں بعہدِ سلطان سکندر تین سو ایرانی علما و صوفیا کے ہمراہ کشمیر پہنچے - اسلامی تہذیب و تمدن کا جو پودا حضرت بلبل شاہ نے کشمیر کی خاک میں لگایا وہ اب بار آور ہو چکا تھا۔ اس ارضِ مینو نظیر کے باشندے فارسی شاعری کے اس قدر گرویدہ ہو چکے تھے کہ وہ شیراز کے گوشہ نشین شاعر حافظ کے کلام پر رقص کیا کرتے تھے کشمیریوں کی اس قدر دانی کی شہرت ایرانیوں تک پہنچ چکی تھی۔ حافظ شیرازی (۷۲۶ - ۷۹۱ھ) نے اس کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

بشعرِ حافظِ شیراز می رقصند و می نازند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

یہی وہ زمانہ ہے جب فارسی کشمیر کی سرکاری زبان بنی - سلطان شہاب کشمیر کا بڑا فاتح اور علم دوست سلطان گزرا ہے - نظامی بدایونی مؤلفِ قاموس المشاہیر کے بقول اس عہد میں کشمیر اجتماعی لحاظ سے کامل طور پر ایرانی تمدن کے زیر اثر آگیا تھا۔ سلطان نے ۸۵۵ھ میں کابل، غزنی اور قندہار کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیا تھا۔ ۸۵۰ھ میں سید محمد نوربخش قہستانی ایران سے بلتستان گئے اور اسلام کی تبلیغ کی۔ آپ نے نوربخشیہ فرقہ کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں سلطان حسن شاہ کے عہد کے خاتمہ پر ۸۹۲ھ میں میر شمس الدین عراقی وہاں گئے اور شیعیت

---

[1] حشمت اللہ خان، تاریخ جموں، ص ۵۸۸

کو مستحکم کیا۔

سلطان زین العابدین ملقب بہ بڈھ شاہ (شاہ اعظم) (۸۲۷ - ۸۷۹ھ) کے دورِ حکومت میں ایران و ترکستان کے صوفیا اور علما تو کشمیر پر بس ٹوٹ ہی پڑے تھے۔ سلطان کے درباری مؤرخ جونراج نے ایرانیوں کے کشمیر میں ورود پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ "واقعاتِ کشمیر" میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہے:

"بر اثر جلب ہدایا و خلعت ہائے کہ سلطان ارزانی دارد و بعلت شفقت و مہربانی وی مسلمانان مثل ملخ ہا ..... بکشمیر وارد می شوند و مانند طوفانی ..... این بیگانہ ہا رسوم و عادات اہالیِ کشمیر را ویران می ساختہ اند"

اس شکایت سے ان مراسم و روابط کا پتہ چلتا ہے جو نویں صدی ہجری میں اہلِ ایران و کشمیر آپس میں رکھتے تھے۔ تاریخ "نوادر الاخبار" کی شہادت کے مطابق تیمور کے فرزند شاہ رخ میرزا نے سلطان زین العابدین کے لیے ہاتھی، لعل اور جواہر ہدیہ کے طور پر بھیجے تھے۔ یہ تحائف وصول کر کے سلطان نے شاہ رخ میرزا کو لکھا کہ مناسب یہ تھا کہ آپ ان تحائف کی بجائے علما کو کشمیر بھیجتے۔ چنانچہ سلطان کی اس درخواست پر شاہ رخ میرزا نے چھ علما کو کشمیر بھیجا تاکہ یہاں کے باشندے ان کے فیوض سے بہرہ ور ہوں۔ اس نے کچھ کتابیں بھی بھجوائی تھیں۔

"طبقاتِ اکبری" میں مرقوم ہے کہ سلطان زین العابدین کے والیِ خراسان ابوسعید میرزا، والیِ آذربائیجان و گیلان جہان شاہ اور سلطانِ ترکی کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان علما و شعرا کی سرپرستی، ثقافت و ادب کی اشاعت اور رواداری میں اکبر اعظم کا پیشرو تھا۔ زین العابدین کئی زبانوں کا عالم تھا اور ایک آدھ کتاب اس نے خود بھی تالیف کی تھی۔ اس نے سرینگر میں دارالعلوم اور دارالترجمہ قائم کیا تھا۔ دارالترجمہ میں مسلمان اور ہندو عالم شب و روز سنسکرت کی کتابوں کے تراجم فارسی میں اور فارسی کتابوں کے تراجم سنسکرت میں کرتے تھے۔ ان میں مہابھارت، راج ترنگنی اور کتھاسرت ساگر قابلِ ذکر کتابیں ہیں جن کے ترجمے فارسی زبان میں کیے گئے۔ سلطان نے جو یونیورسٹی قائم کی تھی اس میں یہ علما درس دیا کرتے تھے:

مُلّا احمد کشمیری، مولوی کبیر، مُلّا ندیمی، ملّا صدرالدین کاشی، ملّا جمیل، ملّا احمد رومی، ملّا علی شیرازی، مولانا حسین غزنوی، سید محمد بیہقی، قاضی میر علی اور سید ناصرالدین بیہقی۔ ان اداروں کے علاوہ سلطان نے ایک دارالتصنیف اور ایک عظیم الشان لائبریری بھی قائم کی تھی۔ کشمیر کی شہادت کے مطابق یہ لائبریری ایران و ترکستان کی لائبریریوں کے ساتھ برابری کرتی تھی۔

علوم اسلامی اور زبان و ادب کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے ہندوؤں میں بھی تعلیم کا شوق پیدا ہوگیا اور انھوں نے فارسی و عربی میں مہارت حاصل کر کے بڑے بڑے اہم سرکاری عہدوں پر قبضہ کرلیا۔ بطور مثال پنڈت شریور کا نام لیا جاسکتا ہے جس نے یوسف زلیخا کا ترجمہ سنسکرت میں کیا تھا۔ سلطان زین العابدین کو کشمیر میں فنِ خوشنویسی کا مروج بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس نے دو آدمیوں کو سمرقند بھیجا اور انھوں نے وہاں صنعت کاغذ سازی و صحافی (جلد بندی) میں تربیت پاکر اپنے وطن میں ان صنائع کو عام کیا۔ ابریشم سازی اور پارچہ بافی کی صنعت کو بھی سلطان زین العابدین نے ہی کشمیر میں پھیلایا تھا۔

اہلِ کشمیر نے شروع شروع میں تقلید کر کے ایران اور ایشیائے مرکزی کی صنعتوں کو سیکھا تھا لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے ذوق سے ان کو ایسی ترقی دی کہ بعد میں یہ صنائع کشمیر سے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔

یہ تو تھی کشمیر پر ایران کے تمدنی، علمی اور لسانی اثرات کی داستان! اب آیئے۔ دونوں ملکوں کے روحانی و مذہبی تعلقات کا جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ ایران کے عقائد اور مذہب نے کہاں تک اہلِ کشمیر کو متاثر کیا۔

ہم بتا آئے ہیں کہ اسلام سید بلبل شاہ اور ان کے بعد سید علی ہمدانی اور پھر ان کے خواہر زادے سید محمد نوربخش کی کوششوں سے وادیٔ کشمیر، کرگل، اور بلتستان میں پہنچا اور پھیلا تھا۔ لیکن بعض فرقوں کے عقائد بھی کشمیر میں ایرانیوں کی مساعی سے پہنچے تھے۔ مشہور انگریز مورخ آرنولڈ کا نظریہ ہے کہ الموت کے باطنیہ نے کشمیر میں داخل ہو کر اپنے عقائد و نظریات کی تبلیغ کی تھی۔ سید محمد نوربخش نے اہلِ تسنن و اہلِ تشیع کے درمیان ایک اعتدال کی راہ پیدا کر کے دونوں فرقوں کو نزدیک تر لانے کی سعی و کوشش کی اور نوربخش

فرقہ اسی اعتدال کی راہ پر گام زن ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر شمس الدین عراقی نے کشمیر اور بلتستان کے نواحی میں شیعہ عقائد کی تبلیغ کی۔ عراقی ۸۹۲ھ میں بعہد سلطان حسن شاہ (۸۸۰-۸۹۳ھ) خراسان کے گورنر سلطان حسین میرزا کی طرف سے سفیر بن کر کشمیر آیا تھا۔ چک خاندان کے بادشاہ جو ۹۶۳ سے ۹۹۲ ہجری تک برسر اقتدار رہے، شیعہ مذہب کے پیرو تھے اور انھوں نے شیعیت کو کشمیر کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔

شاہ میری اور چک خاندانوں کے دورِ حکومت میں اہلِ کشمیر کی بیشتر توجہ تصوف و عرفان پر رہی۔ ان ادوار میں کشمیر نے حضرت شیخ مخدوم حمزہ بابا داؤد خاکی، شیخ محمد یعقوب صرفی، بابا علی رینہ، شیخ احمد چاگلی وغیرہ جیسے اکابر صوفیہ کو جنم دیا۔ ان صوفیا کا تعلق سہروردیہ اور کبرویہ سلسلوں سے تھا۔ ایرانی موسیقی بھی ان صوفیا کی خانقاہوں میں پھلتی پھولتی رہی۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ مکاتبِ موسیقی ایران و توران کے موسیقی دانوں کے وسیلہ سے کشمیر میں متعارف ہوئے۔ سلطان زین العابدین کے عہد میں ملا عودی خراسانی کشمیر آیا اور اس نے ایرانی موسیقی کی تعلیم دی۔ وہ زبردست ماہر موسیقی تھا۔ خاص طور سے نے نوازی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ ابوسعید میرزا نے اپنے عہد کے مشہور و ممتاز موسیقی دان ملّا جمیل کو سلطان زین العابدین کے دربار میں بھیجا تھا۔ سلطان کی قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ وہ دیگر انعام و اکرام کے علاوہ کبھی کبھی آلاتِ موسیقی کو سیم و زر سے پُر کر کے موسیقی دانوں کو عطا کیا کرتا تھا۔ مجالسِ رقص بھی منعقد ہوتیں اور ان میں پنڈت بھتاوتار شاہ نامۂ فردوسی کو پڑھا کرتا۔

کشمیر میں اسلام کے ورود سے قبل یہاں کی زبان سنسکرت تھی۔ بعد میں جب فارسی اس علاقہ میں عام بول چال کا ذریعہ بنی تو اس اختلاط کے نتیجے میں ایک اور زبان وجود میں آئی جسے کشمیری زبان کہا جاتا ہے۔ کشمیری کے ساٹھ فی صدی سے بھی زیادہ لغات و تعبیرات خصوصاً اصطلاحات دینی و ادبی اور رسم الخط فارسی ہے۔ کشمیری شاعری میں فارسی زبان و ادب کا اثر تو بالکل واضح اور مسلم ہے۔ اکثر فارسی تلمیحات اور داستانیں کشمیری میں منتقل ہوئیں اور ایران کی داستانیں ترجمہ کی گئیں۔ مثال کے طور پر کشمیر کے شاعر وہاب پرے (۱۲۶۲-۱۳۲۳ھ) نے شاہنامۂ فردوسی کو کشمیری کا جامہ پہنایا۔ اس نے قصۂ بہرام گور اور قصۂ چہار درویش کو

بھی کشمیری نظم میں منتقل کیا تھا۔ ترجمہ کرنے کے علاوہ وہاب پرے نے شاہنامۂ فردوسی کا تکملہ خلافت نامہ کے نام سے خود بھی نظم کیا تھا جس میں ترکی کے خلیفہ سلطان عبدالمجید کے حالات بھی درج تھے۔ محمود گامی نے بھی نظامی گنجوی کی پیروی میں کشمیری میں خمسہ کہا تھا۔ اسی طرح مقبول شاہ کرالہ واری نے ایرانی شعرا کی ہی تقلید میں گلریز اور گرست نامہ کی داستانوں کو کشمیری نظم میں بیان کیا۔ مقبول نے داستان گلریز کو ایک فارسی کتاب عجب ملک ونوش لب سے لیا تھا۔ ایک اور کشمیری شاعر مولوی صدیق اللہ (م ۱۳۱۷ھ) نے نظامی کے سکندر نامہ کو کشمیری نظم میں ترجمہ کیا۔ عزیز اللہ حقانی نے داستان شیخ صنعان کو اور سیف اللہ نے دامق و عذرا اور رستم و سہراب کو کشمیری نظم میں قلم بند کیا۔

جہاں ایران کے عالم، شاعر اور ہنرمند کشمیر آتے رہے وہاں یہ بات بھی ہے کہ یہاں سے بھی عالم و شاعر ایران جاتے رہے۔ کشمیر کے مشہور آفاق صوفی، عالم، شاعر اور مؤلف شیخ محمد یعقوب صرفی نے ترکستان و افغانستان کے علاوہ سبزوار، مشہد اور قزوین کا بھی سفر کیا تھا اور ایرانی نقاد و مؤرخ سعید نفیسی مرحوم کے بقول صرفی نے شاہ طہماسپ صفوی سے ملاقات کر کے اسے نصیحت کی تھی کہ وہ سنیوں کے بارے میں تعصب چھوڑ دے۔ صفوی دور میں کشمیر کے مشہور فارسی گو مظہری نے ایران کا سفر کیا۔ وہ کچھ عرصہ کاشان میں مقیم رہا اور ملا محتشم کاشی اور پھر وحشی بافقی سے استفادہ کرتا رہا۔

اکبر اعظم نے کشمیر کو ۹۹۳ھ میں سلطنت مغلیہ میں شامل کیا تھا۔ اس کے ساتھ فیضی اور ابوالفضل ایسے علما بھی کشمیر جانے لگے تھے۔ اسی زمانے میں اکبر نے ملا شاہ محمد شاہ آبادی کشمیری سے کلہن کی تاریخ کشمیر راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ کروایا تھا۔ مغلوں نے اپنے ادوار حکومت میں کشمیر میں ۶۳ گورنر بھیجے جن میں سے دس فارسی زبان کے زبردست شاعر تھے اور یہ ایرانی بھی تھے۔ مثال کے طور پر خواجہ ابوالحسن ترتبتی خراسانی، اس کا بیٹا ظفر خاں احسن اور اس کا بیٹا عنایت خان آشنا ایرانی شاعر تھے جو مغلوں کی طرف سے کشمیر کے گورنر رہے۔ اس عہد میں کشمیر فارسی زبان و شاعری کا مرکز بن گیا تھا۔ حکمران شعرا کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جس کی وجہ سے ایران و ہند کے فارسی گو شاعر کشمیر میں آتے اور مقیم ہوتے رہے اور یہیں مدفون ہوئے۔ چنانچہ سرینگر میں

مزار الشعرا اس کا زندہ ثبوت ہے۔ مزار الشعرا میں حاجی جان محمد قدسی مشہدی، ملا طغرا مشہدی، میر فتح اللہ شیرازی، میرزا محمد قلی سلیم طہرانی، حکیم ابو طالب کلیم ہمدانی، شیدا فتح پوری، عنایت اللہ خان آشنا ایسے باکمال شاعر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے علاوہ رضی دانش مشہدی، صائب تبریزی، طالب آملی، میر الٰہی ہمدانی بھی کچھ عرصہ کشمیر میں مقیم رہے

عہد مغلیہ اور اس کے بعد سرزمین کشمیر نے جن بڑے شاعروں، مورخوں اور مؤلفوں کو جنم دیا۔ ان میں یعقوب صرفی، سکھ جیون مل، فردوسیٔ کشمیر ملا حمید اللہ شاہ آبادی، ملا محسن فانی پنڈت نرائن کول عاجز، دیوان کرپا رام، خواجہ اعظم دیدہ مری، پیر حسن شاہ وغیرہ شامل ہیں۔ کشمیر کے فارسی گو شعرا میں فانی، مظہری، اوجی، گویا، جویا، غنی، اسلم اور حمید اللہ شاہ آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

سرزمین کشمیر میں مدرسہ کی تعمیر بلبل شاہ کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔ اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ مدارس دینی بھی تعمیر اور آباد ہوتے چلے گئے۔ جہاں کہ تشنگان علم و ادب اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ لیکن کشمیر کے طلبا اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برعظیم پاکستان و ہند کی درس گاہوں کا رخ بھی کیا کرتے تھے۔ کشمیر اور برعظیم کی دینی درس گاہوں میں جو نصاب تعلیم مروج تھا وہ بھی ایرانی علما و فلاسفہ کا مرتب و مدون کردہ تھا۔ مثلاً علوم معقول و منقول کی مندرجہ ذیل کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جن کے مؤلف ایرانی ہیں:

تفسیر: ابن جریر طبری۔ امام فخر رازی۔ قاضی بیضاوی۔

حدیث: امام اسماعیل بخاری، عبدالرحمٰن نسائی، ابو عیسیٰ محمد الترمذی، ابو عبداللہ ابن ماجہ قزوینی، ابو داؤد سجستانی، حاکم نیشاپوری، ابو نعیم اصفہانی، امام بیہقی۔

صرف و نحو: سیبویہ، کسائی، عبدالقاہر جرجانی، جار اللہ زمخشری، سکاکی، جامی۔

اخلاق و کلام: شہرستانی، نصیر طوسی، احمد سرخسی، ابن سینا، ملا صدرا شیرازی، امام غزالی۔

عرفان و تصوف: قشیری، نجم الدین کبری، جلال الدین رومی، فرید الدین عطار، شہاب الدین سہروردی۔

مغلیہ عہد میں ایران کے ہنر معماری و نقاشی و مصوری کو کشمیر میں اور نکھرنے کا موقع ملا۔

یہ ہنر مسجد و مدرسہ، خانقاہ و قلعہ اور کاخ و مزار میں آشکارا ہوا۔ بھمبر کی مسجد منقش سے لے کر حضرت بل سرینگر تک تعمیر، نقاشی اور خطاطی کے ایسے نادر نمونے آج بھی موجود ہیں۔ جن کی اصل ایرانی ہے اور وہ تیموریانِ ہند کے عہد میں کشمیر پہنچ کر نقشِ دوام بنے۔ کشمیر کی نقاشی کے چوبیس نمونے جن کا تعلق سولھویں صدی عیسوی سے ہے آج وکٹوریہ میوزیم اور البرٹ میوزیم (لندن) میں محفوظ ہیں۔ مغلیہ عہد کی نقاشی کے باقی نمونے باغِ نشاط اور شالامار سرینگر کی بارہ دری کی دیواروں پر موجود ہیں۔

قالین سازی و شال بافی کی صنعت کشمیر میں سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت میں پہنچی تھی۔ مغلوں کے عہد میں کشمیری صنعت کاروں نے وہ چرب دستی و تر دماغی دکھائی کہ پھر ان کی تقلید کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ کشمیر کے مؤلف مرحوم ڈاکٹر صوفی لکھتے ہیں کہ مسجد اردبیل کا قالین جسے ۹۴۲ھ میں مقصود کاشانی نے بنایا تھا اور آج وہ لندن میوزیم میں موجود ہے، اس کا نمونہ کشمیر میں ۹۰۲ھ میں تیار کیا گیا۔ اسی طرح ابریشم سازی کی صنعت پہلے پہلے بخارا سے کشمیر آئی اور پھر یورپ پہنچی۔ کشمیری مہر سازی میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ ساخت کے اعتبار سے کشمیر میں بنی ہوئی مہروں کے نمونے سمرقند، بخارا، ایران اور استنبول میں ملتے ہیں۔ یہ امر واضح کرتا ہے کہ کشمیر کس طرح علوم و فنون، صنعت و حرفت اور فکر و عقیدہ میں ایران کے زیرِ نگین رہا ہے۔

ایران کے آذر کیوانی زردشتی بھی اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے شیراز سے کشمیر پہنچے اور چند مبلغ وہیں فوت بھی ہوئے۔

کشمیر پر ۱۱۶۶ھ میں افغانوں کا قبضہ ہوا اور اس کے بعد خراسانی تمدن نے اور بھی وسعت پائی۔ کشمیر کے جن فارسی گو شاعروں نے اس عہد میں نام پیدا کیا ان میں شائق، توفیق، اشرف، دیری اور سکھ جیون مل اور بھوانی داس کا چرو قابلِ ذکر ہیں۔ افغانوں کے بعد سکھوں کے دورِ اقتدار میں کمند رام ہندو، تابہ رام زکی، نرائن داس ضمیر، لچھمن رام سرور، شنکر جیو آخون گرامی، بہاءالدین متو اور ملا حمید اللہ فارسی کے نامور شاعر تھے۔ حمید اللہ نے فردوسی کی تقلید میں سکھوں اور افغانوں کی جنگ کا حال نظم کیا اور اس رزمیہ مثنوی کا نام اکبر نامہ رکھا۔ اکبر نامہ کابل میں

طبع ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فارسی کی اشاعت میں پیش پیش رہے اور انھوں نے متعدد کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا۔ ان میں بیربل کا چرو خاص طور سے قابل ذکر ہے جس نے مہاشیو پوران کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ ریاست جموں وکشمیر پر ڈوگروں کی حکومت ۱۲۶۳ سے ۱۳۶۵ھ تک رہی۔ ڈوگرے فارسی زبان وادب اور شعر وشاعری کے کچھ زیادہ دلدادہ نہ تھے۔ تاہم رنبیر سنگھ کے عہد میں جموں میں فارسی کے مدرسے اور ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس دارالترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں تراجم کیے گئے۔ فارسی اس دور میں بھی اہلِ کشمیر کی سرکاری زبان رہی۔ محکمہ مال، عدالتوں اور دفتروں کا سارا کاروبار فارسی میں ہوتا تھا۔ اس عہد کی اہم فارسی تالیف گلاب نامہ اور گلزارِ کشمیر ہے جسے وزیر دیوان کرپارام نے تحریر کیا تھا۔ پنڈت گوپال کول نے بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ مہابھارت اور اپنیشد کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا گیا۔ دوسرے شاعروں اور مورخوں میں خواجہ حسن شعری، پیر غلام حسن شاہ، حاجی محی الدین مسکین قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے فارسی زبان وادب کو زندہ کیا۔

اس مختصر سے جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم ایام سے لے کر موجودہ زمانے تک جموں سے لداخ تک خطۂ جموں وکشمیر پر بشمول تبت، ایرانی تہذیب وتمدن، زبان وادب اور فلسفۂ مذاہب کا زبردست اثر رہا ہے۔ یہ اثر آج بھی یہاں کے شہر و دیہات میں نمایاں ہے۔ انگریزوں کے دورِ غلامی میں ایران وکشمیر کے تعلقات کو دھچکا ضرور لگا لیکن مغربی تہذیب کی براقی ان دیرینہ روحانی وفکری تعلقات کو ختم نہ کر سکی۔

۱۹۴۷ء/۱۳۶۶ھ میں برعظیم تقسیم ہوا اور ایک نیا ملک پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔ ریاست جموں وکشمیر بھی سال مذکور میں جہاد آزادی کے نتیجے میں عارضی طور پر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ریاست کے جس حصہ پر بھارت نے قبضہ کر لیا اسے مقبوضہ کشمیر کہا جاتا ہے اور جو علاقہ آزاد ہوا اسے آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ تبتِ خورد یعنی بلتستان اور گلگت کے علاقے براہِ راست حکومت پاکستان کے انتظام میں ترقی کر رہے ہیں۔

آزاد کشمیر میں ضلع میرپور، پونچھ اور مظفر آباد کے علاقے شامل ہیں۔ یہاں بھی فارسی کا

اثر و نفوذ رہا ہے۔ تینوں اضلاع میں سینکڑوں علما آپ کو فارسی و عربی کے مل جائیں گے۔ اکثر مقامات پر صوفیا اور علما کے ذاتی کتاب خانے بھی ہیں۔ جن میں مطبوعہ کتب کے علاوہ قلمی نسخے بھی مل جاتے ہیں۔ دیہات کی مساجد میں بچوں کو کریما، نام حق، گلستان اور بوستان کا درس دیا جاتا ہے۔ یہاں کے مدارس میں چھٹی جماعت سے کالج کی سطح تک فارسی ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ فارسی زبان کے کئی شاعر بھی موجود ہیں۔

آزاد کشمیر کی زبانوں، پہاڑی، گوجری، کشمیری، بلتی، شینسا وغیرہ میں کم و بیش چالیس فی صد الفاظ فارسی ہی کے استعمال ہوتے ہیں۔

آزاد کشمیر کے دارالحکومت میں سرکاری ملازمین اور دیگر کاروباری حضرات کو تعلیم کی سہولتیں دینے کی غرض سے حکومت نے ۱۹۵۱ میں مظفر آباد میں ایک سرکاری اورینٹل کالج قائم کیا تھا۔ اس کالج میں عربی و اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کی تدریس بھی ہوتی تھی۔ فارسی میں منشی، منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کروائے جاتے تھے۔ یہ کالج ماضی قریب تک کام کرتا رہا۔ اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ نے بعد میں سیاست، صحافت، قانون، تعلیم، ادب و شاعری میں نام پیدا کیا۔

عربی کے بعد مسلمانان جموں و کشمیر کی دوسری مذہبی زبان فارسی ہے اس لیے مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی فارسی دشمن کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں اور وہاں کے مدارس اور کالجوں میں بھی فارسی پڑھائی جاتی ہے۔ کشمیر یونیورسٹی میں فارسی کا شعبہ قائم ہے اور اس شعبہ کی طرف سے فارسی میں ایک مجلہ "دانش" نکلتا ہے۔ سری نگر میں ایک ریسرچ کا شعبہ بھی قائم ہے جس میں فارسی مطبوعہ کتب اور قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ چند سال قبل وہاں سے دیوانِ غنی شائع ہوا ہے۔ مرحوم عبدالقادر سروری نے "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" ۱۹۶۸ میں شائع کی تھی۔

اب آیئے موجودہ بلتستان میں فارسی کے اثر پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ بلتستان کوہ قراقرم کے درمیان واقع ہے۔ یہ شاہراہ قدیم زمانوں میں بخارا، سمرقند، کاشغر اور بدخشان کو کشمیر سے ملاتی تھی۔ اس علاقہ میں سید علی ہمدانی، میر محمد ہمدانی، سید محمد نوربخش، میر شمس الدین عراقی اور ان کے بعد کئی اور ایرانی علما نے اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ بعد کے زمانے میں سکردو

شگر، خپلو شیعیت اور فارسی زبان کے مرکز بن گئے۔ خود اہلِ بلتستان میں بے شمار شعرا فارسی میں مراثی و قصائد کہتے تھے۔ کئی علما نے فارسی نظم و نثر میں تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ علما کے ذاتی کتب خانے بھی ہیں۔ بلتستان میں سنی، شیعہ، نوربخشیہ، اسماعیلیہ فرقوں کے علاوہ بہائی فرقہ کے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جن کی دینی زبان فارسی ہے اور وہ الواح و مناجات فارسی ہی میں پڑھتے ہیں۔ بلتستان کے اسکولوں میں فارسی پڑھائی جاتی ہے۔ بلتی زبان میں ساٹھ فی صد الفاظ فارسی کے ہیں۔ بلتستان کے شہر و دیہات، مکانوں کا طرزِ تعمیر، لباس اور رسم و رواج ہر چیز بالکل ایران جیسی ہے۔

پیغمبرِ انسانیت : مولانا محمد جعفر پھلواروی

سیرتِ رسولؐ پر یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس میں صرف واقعات درج کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ اس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے کہ زندگی کے نازک سے نازک مراحل میں آنحضرتؐ نے انسانیت اور اعلیٰ انسانی قدروں کی کس قدر محافظت فرمائی ہے۔

صفحات ۸+۶۲۰ قیمت : ۱۲ روپے

زیردستوں کی آقائی : مولانا محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب مصر کے نامور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی مشہور تصنیف "الوعد الحق" کا ترجمہ ہے۔ اندازِ تحریر شگفتہ ہے۔ اس میں طٰہٰ حسین کے سوانح حیات بھی درج کیے گئے ہیں۔

صفحات : ۲۶۰ قیمت : ۴/۲۵ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ارمغانِ حالی

منتخبہ و مرتبہ : پروفیسر حمید احمد خان مرحوم

یہ کتاب شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی کی تمام نظم و نثر کے انتخاب اور اس انتخاب کی برمحل تشریح و توضیح پر مشتمل ہے ۔ یہ مجموعہ مولانا حالی کی اس عظیم الشان فکری و تخیلی کاوش کا آئینہ ہے ، جس کی بنیاد پر مولانا نے نصف صدی سے کچھ زیادہ مدت تک تعمیرِ قوم کی کوششوں کو جاری رکھا ۔ حالی کے مشہور و معروف تنقیدی و سوانحی کلام کے علاوہ متفرق موضوعات پر مولانا کے جواہرِ انشا مناسب تلاش و تفحص سے حصۂ نثر میں چن دیے گئے ہیں ۔ چنانچہ مولانا کے دینی ، تعلیمی اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے سیر حاصل اقتباسات شاملِ کتاب ہیں اور ہر ایک اقتباس کے سالِ تصنیف کی صراحت کر دی گئی ہے ۔ یہی عمل حصۂ نظم میں بھی جاری ہے ۔

کتاب کے آغاز میں ایک مفصل اور پُر از معلومات مقدمہ ہے جو متن کے تمہیدی اشارات اور تشریحی حواشی سے الگ اپنی ایک خاص معنویت رکھتا ہے ۔

صفحات : ۳۱۶ قیمت : قسم اول : ۱۴ روپے

" قسم دوم : ۹ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور